تلخیص

پایان نامه

برای دریافت درجه دکتری (Ph.D)

موضوع

بررسئ انتقادی زبور عجم علّامه اقبالؔ لاهوری

نگارش : تقدیم کننده
تسنیم کوثر چشتی

تحت نظارت:
دکتر قمر غفار

بخش فارسی
دانشگاه جامعه ملّیه اسلامیه
دهلی نو (هند)

سال تحصیلی ۲۰۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنام خداوند جان وخرد

نعرہ زد عشق کہ خونین جگری پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظری پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گری، خود شکنی، خود نگری پیدا شد
خبری رفت زگردون بہ شبستان ازل
حذر ای پردگیان، پردہ دری پیدا شد

علامہ محمد اقبال کی شخصیت دنیائے علم وادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ان کی تخلیقات نے انہیں نہ صرف برصغیر ہند میں بلکہ تمام عالم اسلام میں تاابد زندۂ وجاوید بنادیا ہے۔ان کی ان ہی تخلیقات میں سے ایک بنام "زبور عجم" میرے مطالعہ کا موضوع رہی ہے۔میں نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی ترتیب میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ کوئی بھی چیز حد سے متجاوز نہ ہو۔اس لیے چند انتہائی اہم چیزوں کو تفصیلی طور پر لیا ہے اور بقیہ کو عنوان کی جامعیت اور افادیت میں اضافے کے تحت شامل کیا ہے۔

مقالے کے پانچ ابواب میں میری یہ کوشش رہی ہے کہ ان تمام باتوں کا احاطہ کر سکوں جو "زبور عجم" میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ سعی بلیغ کے باوجود چند چیزیں باقی رہ گئی ہوں۔امید ہے کہ قارئین کرام میری ان کوتاہیوں کو نظرانداز کریں گے۔

"زبور عجم" علامہ اقبال کے فارسی کلام کا چوتھا مجموعہ ہے جو تین سال کی جانفشانی کے بعد جون ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آیا۔"زبور عجم" میں مثنوی گلشن راز جدید اور "بندگی نامہ" بھی شامل ہے۔

اقبال نے غزلیات "زبور عجم" کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔پہلے حصے میں علامہ نے خدا سے خطاب کیا ہے اور دوسرے حصے میں تمام عالم بالخصوص مشرق کو مخاطب کر کے بیداری کا پیغام دیا ہے نیز یادِ

عہدِ ماضی، حرکت، بیداری، ذوق عمل، محبت اور رجائیت پر مبنی زندگی کا درس دیا ہے تاکہ عہدِ رفتہ کی شان و شوکت اور تجمل و حشمت دوبارہ حاصل کی جاسکے اور مشرق ایک بار پھر مادی اور روحانی دنیا پر اپنی برتری کا پرچم لہرا سکے۔

"زبورِ عجم" حصہ اول میں کل تعداد غزلیات - ۵۶

"زبورِ عجم" حصہ دوم میں کل غزلیات کی تعداد - ۷۵

"زبورِ عجم" کی غزلیات کی مجموعی تعداد - ۱۳۱

باب اوّل: علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی اور ان کی اہم تصانیف پر مشتمل ہے جس میں پہلے ان کی درست تاریخ ولادت، خاندان اور حصول تعلیم کے مختلف مراحل کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو مختلف تعلیمی سفر کیئے۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؔ کے ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء کے سفر انگلستان، جرمنی تا مراجعت بہ ہندوستان (۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء) تک جملہ معلومات فراہم کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کن کن لوگوں سے استفادہ کیا ہے۔ جن میں میں نے شمس العلماء مولوی سید میر حسن، فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی، پروفیسر آرنلڈ، جرمنی کے مشہور پروفیسر میک ٹیگر بٹ جیسی عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر کیا ہے۔ بعد ازاں علامہ اقبال کی شہرت کا آغاز کب ہوا اس سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں نیز تحصیل علوم و فنون سے فراغت کے بعد ان کے مشاغل کیا تھے اور کن کن اداروں کو علامہ موصوف کی خدمات حاصل رہیں ان میں اورینٹل کالج لاہور، انجمن کشمیری مسلمانان ہند، انجمن حمایت اسلام وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ بعد اُن اعزازات کا ذکر کیا ہے جن سے اس محسن ملت کو نوازا گیا مثلاً ۱۹۲۲ء میں حکومتِ برطانیہ کے ذریعہ عطا کیا گیا "نائٹ" (سر) کا خطاب شامل ہے۔

عملی سیاست میں اقبالؔ کب داخل ہوئے اس کا اجمالی جائزہ لیا ہے جس سے یہ بات بخوبی عیاں ہے کہ ان کی تمام تر زندگی سیاسی، معاشرتی اور فکری اصلاح کی سعی میں گزری اور انہوں نے اپنے کلام کے ذریعہ تمام عالمِ انسانیت کو جاں بخش و بصیرت افروز پیغام سنایا اور انہیں عمل کے لئے ابھارا۔

باب دوم: میں علامہ اقبالؔ کے اہم معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے جس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اوّل ان معاصرین کو لیا ہے جن کا تعلق سر زمین ہند سے ہے۔ دوم وہ معاصرین میرے پیش نظر رہے ہیں جو باوجود ایرانی ہونے کے نہ صرف ان کے مراسم ہی علامہ اقبال سے کافی گہرے رہے بلکہ ان حضرات نے فن شعر میں علامہ اقبال کے مسلم الثبوت استاد ہونے کو بھی تسلیم کیا ہے۔ جن میں حسب ذیل حضرات شامل ہیں:

(الف) ہندوستانی معاصرین

منشی دیانرائن نگم	وحشت کلکتوی
مولوی الف دین	اسلم جیراج پوری
شاد حیدر آبادی	غلام بھیک نیرنگ
سجاد حیدر یلدرم	وصل بلگرامی
عبدالماجد دریابادی	الیف۔ایم۔ شجاع
مولانا الطاف حسین حالی	ظفر احمد صدیقی
ڈاکٹر ضیاء الدین	ظفر احمد صدیقی
سر راس مسعود	سیّد شوکت حسینی
سید سراج الدین	میجر شمس الدین قریشی
شیخ عنایت اللہ	رغیب احسن
نیاز الدین خان	مہاراجہ کشن پرشاد شاد
سید نذیر نیازی	خواجہ عبدلوحید
مولانا شیخ غلام قادر گرامی	مرزا جلال الدین
میاں محمد شافعی	چودھری محمد حسین
محمد عبداللہ چغتائی	غلام رسول مہر

سید امجد علی لاہوری
عبدالمجید سالک لاہوری
تاثیر لاہوری
حمید احمد خاں
خضر تمیمی
سعادت علی خاں
فقیر سید وحیدالدین
راجہ صاحب محمود آباد
متولی محمد عبدالجلیل بنگلوری
محمد ناصر الملک ہزہائنس والی چترال

میاں بشیر احمد لاہوری
حفیظ ہوشیارپوری
خواجہ عبدالحمید
عابد علی عابد
واقف بٹالوی
عبدالرشید طارق
شبلی نعمانی
سید سلیمان ندوی
اسد ملتانی
عبدالرحیم پیشاوری

(ب) معاصرین ایرانی

بہار مشہدی
محیط طباطبائی
ڈاکٹر حسین خطیبی
کچکینہ کاظمی
علامہ علی اکبر دھخدا
ڈاکٹر منوچہر اقبال
صادق نشاط
محمد تقی مقتدری
کاظم رجوی

صادق سرمد
سعید نفیسی
مجتبیٰ مینوی
سید محمد علی داعی الاسلام
سید حسن تقی زادہ
ڈاکٹر لطف علی صورتگر
محمد حسین مشایخ فریدنی
ڈاکٹر نظیر زادہ کرمانی
ادیب بیرومند

حبیب یغمائی	ڈاکٹر قاسم رسا مشہدی
علی صدارت نسیم	احمد گلچین معانی
علی خدائی	رضا ئی
منوچہر طالقانی	حسین
ڈاکٹر محمد مصدق	مجتہد زاہدی
خانم پروانہ صدر اعظم نوری	رضازادہ شفق

باب سوم: میں فارسی غزل گوئی میں اقبال کا کیا مقام ہے اس پر تفصیلی روشنی ڈالنے سے پیشتر غزل کی تعریف اور اس کے ارتقا کا مختصر ذکر شامل ہے۔ بعد ازاں دیگر فارسی غزل گو شعراء سے موازنہ بھی کیا ہے۔ تاکہ فارسی غزل گوئی میں علامہ موصوف کا مقام و مرتبہ متعین کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال بنیادی طور پر غزل سرا شاعر تھے انہوں نے غزل سرائی میں ایک نئے باب کا آغاز کیا اور جس والہانہ اشتیاق سے غزل کو جلا دی وہ غزل کی تاریخ میں ایک نئی نہج اور نئے دور کی آئینہ دار ہے۔

باب چہارم میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ اقبال کی شخصیت اور ان کے فن پر کن کن شعراء کا اثر پڑا ہے۔ ہر شاعر اپنی زندگی میں کسی نہ کسی سے متاثر ضرور ہوتا ہے کچھ شعوری طور پر اور کچھ غیر شعوری پر۔ اقبال بھی اپنے معاصرین اور پیشروں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کتنے ہی شعراء اور صوفیوں سے استفادہ حاصل کر کے مختلف رجحانات و فکر و اقوال کی چھاپ اقبال کے کلام میں جگہ جگہ نظر آتی ہے جن بزرگوں کا اثر موصوف کی فکر و آگہی پر زیادہ نظر آتا ہے ان میں ابو القاسم فردوسی، منوچہری دامغانی، ناصر خسرو، مسعود سعد سلمان، سنائی، انوری ابیوردی، خاقانی شروانی، نظامی گنجوی، عطار نیشاپوری، خواجہ معین الدین چشتی، قطران تبریزی، شیخ احد الدین کرمانی، خواجہ عبد اللہ انصاری، رومی، عراقی، سعدی، محمود شبستری، امیر خسرو، حافظ شیرازی، فغانی شیرازی، شیخ رکن الدین اوحدی مراغی، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی، امام فخر الدین یحیٰی ابن معین شیرازی، جمالی دہلوی، تہماسپ، قلی بیگ ملا عرشی یزدی، کمال الدین وحشی بافقی یزدی، مولانا ابو سعید سحابی استر آبادی نجفی، عرفی شیرازی، غزالی مشہدی، امیسی شاملو، ملا محمد

ملک قمی، ملا محمود نور الدین ظہوری، قائنی ترشیزی، فیضی، نظیری نیشاپوری، ابو طالب کلیم ہمدانی، غنی کشمیری، صائب تبریزی، بیدل عظیم آبادی، غالب دہلوی، محمد طالب آملی، مرزا جلال اسیر اصفہانی، قدسی مشہدی، سید رضی دانش رضوی مشہدی، ملا فرج اللہ ترشیزی، عزت بخاری، شیخ عبد العزیز، ملا حسین معمائی گیلانی، ملا احمد فوقی یزدی، مومن استر آبادی، ملا طفرا، ملا رقم، مخلص کاشی، ناصر علی سرہندی، جویا تبریزی کشمیری، مرزا محسن تاثیر تبریزی اصفہانی، مخلص سیالکوٹی، حزین لاہیجی اصفہانی، راسخ سرہندی، مرزا مظہر جانجاناں کے نام قابل توجہ ہیں۔

باب پنجم: میں اقبال کی ''زبور عجم کا مکمل طور سے تنقیدی جائزہ لینے کی سعی فراوان کی گئی ہے۔ جس کا خاکہ حسب ذیل ہے:۔

(الف) بہ اعتبار ہیئت یا قالب:

اس میں ہیئتی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے کہ ''زبور عجم، کی غزلیات کس نوعیت کی ہیں۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے قدیم روایتی ہیئتوں کو ضرور برتا، قافیہ ر ردیف کی پابندی کی۔ وزن کا خیال رکھا بلکہ مصرعوں میں ارکان کی تعداد تک کو ملحوظ رکھا۔ اس کے باوصف شاعری کے خارجی لوازمات کو اپنے آپ پر تقلید کی حد تک طاری نہیں کیا۔

اگر چہ اقبال کی ''زبور عجم'' میں ہیئت کے اعتبار سے انقلابی نوعیت کے تجربے نہیں ملتے وہ ہیئت کے بجائے موضوع کی تنسیخ کے قائل ہیں۔ تاہم علامہ موصوف کا یہ عمل ان کی جدیدیت کے متعلق رویہ کو واضح کر دیتا ہے۔ ذیل میں نقل شدہ شعر سے قارئین اس کا اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور ساز دلعل ناب
از جفای دہ خدایاں کشت دہتاناں خراب

انقلاب ای انقلاب!

اس ضمن میں جملہ موضوعات کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا خصوصی مضامین کا مختصراً ذکر کرنے کی حتی الامکان سعی کی ہے۔

اقبال کی زبور عجم کا بغایت دقت نظری سے جائزہ لیا جائے تو یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس کائنات میں "دل" کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے اس مجموعۂ کلام میں شاید ہی کوئی غزل براہ راست یا بالواسطہ طور پر "دل" کے ذکر سے معریٰ ہو بلکہ بیشتر غزلیات کے مطلعوں کا آغاز "دل" سے ہوتا ہے۔ یا پھر ان کو کلیدی ذکر کی حیثیت حاصل ہے۔ بطور نمونہ دو اشعار ذیل میں نقل ہیں:

دل بکسی نباختہ، یادو جہاں نساختہ
من بحضور تو رسم، روز شمار این چنین

این دل کہ مرادادی لبریز یقین بادا
این جام جہاں بینم روشن ترازیں بادا

"عشق و خرد" اقبال کی شاعری کے بنیادی مضامین میں سے ہیں۔ "زبور عجم" کے دونوں حصوں میں عشق و خرد پر تبصرہ ہے اور ہر مرتبہ اس میں ایک منفرد انداز ملتا ہے۔

علامہ موصوف نے ایک غزل میں فکر و عقیدہ کی غلامی، روایت پرستی، علم و دانش کی بے عناعتی اور فکری انتشار کے ساتھ ساتھ عقل کی اہمیت پر اظہار نظر کیا ہے۔ یہ ٹھوس اور سنگین مضامین موسیقی اور غنائیت سے ہم آہنگ ہو کر دل میں اتر جاتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک 'عشق' زندگی کی قوتِ متحرکہ ہے جس کے ذریعے زندگی تخلیق اور لذتِ ارتقاء سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ عشق کی ولولہ انگیز رہنمائی میں انسان زندگی کے ارفع نصب العین یعنی مبداء اصلی تک رسائی میں کامیاب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شعر بطور نمونہ ذیل میں درج ہے:

عشق زپادر آورد خیمہ شش جہات را
دست درازی کند تا بہ طناب کہکشاں

"زبور عجم" کی بیشتر غزلیات سے شاعر کا جمال مطلق کے مشاہدے کی بے تابی عیاں ہے اس سلسلے میں اقبال کا انداز کبھی جوش و مستی کا ہے اور کبھی عجز و نیاز مندی، خلش اور بے کلی کا ہے۔ شاعر حقیقت منتظر کو لباس مجاز میں دیکھنے کے لیے بے تاب ہے نمونتاً ایک شعر ذیل میں درج ہے جس سے قارئین علامہ موصوف کے جوش و اضطراب کا اندازہ کر سکتے ہیں:

دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذت نظارہ
چہ گنہ اگر تراشم صنمی ز سنگ خارہ
تو بجلوہ درنقابی کہ نگاہ برنتابی
مہ من اگر ننالم تو بگو دگر چہ چارہ

علامہ اقبال نے تصوف کو محض آرائشِ سخن نہیں بنایا بلکہ اس کی مدد سے اپنے عہد کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ سنو، میری جستجو نے دیر و حرم کی نقشبندی محض شاعری کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے نہیں کی اور نہ ہی انھوں نے کسی روایت کی محض پیروی کی ہے بلکہ دیر و حرم کی نقشبندی انھیں اس مقام پر لے آئی کہ ان کے نظامِ فکر میں خدایا قادر مطلق کی کوئی گنجائش نہیں۔

"زبور عجم" میں شاعر نے انسان اور ذات خداوندی کے باہمی رشتے کا اظہار انتہائی اشتیاق و محبت سے کیا ہے اور اس میں صوفیانہ شاعری کا مخصوص لہجہ ہے۔ اقبال کے یہاں وفور محبت اور جذب شوق کے ساتھ ساتھ انسانی انفرادیت کا احساس برقرار ہے اور خودی کی بقا پیش نظر ہے نیز وہ ذاتِ خداوندی کے حضور میں اپنے انفرادی شوق و ذوق کے ساتھ ساتھ گلہ و شکوہ کا اظہار برملا کرتا ہے:

یا مسلمان را مدہ فرمان کہ جان بر کف بنہ
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانی آفرین
یا چنان کن یا چنین

بلکہ کبھی اس کا ردِ عمل ملت یا تمام انسانیت کے احساسات کا ترجمان ہے واقعتاً اقبال نے ملت کے

تقاضوں کو کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ اس کی رہنمائی کے لیے اپنے عمل میں تاثیر کا سائل ہے:

سازی اگر حریفِ یم بیکراں مرا
با اضطراب موج سکونِ گہر بدہ
شاہین من بہ صید پلنگان گذاشتی
ہمت بلند و چنگل ازین تیز تر بدہ

اقبال نے ایک سماجی مفکر کی حیثیت سے محسوس کیا کہ فرد اپنی ذات کے تعین سے جسے انہوں نے "خودی" کا نام دیا ہے۔ اس کا اندازہ قارئین بخوبی نہ صرف "زبور عجم" میں بلکہ ان کے دیگر مجموعہ ہائے کلام میں جا بجا محسوس کر سکتے ہیں کہ کس حد تک انہوں نے شعری حدود میں رہ کر بھی ذات شناسی کے عمل کو کس قدر فکر انگیز بنا دیا ہے۔

عرفانِ ذات یا خودی کے بارے میں اقبال کا یہ رویہ ظاہر ہے مابعد الطبیعاتی سطح پر انسان کی بے چارگی اور فنا انجامی اور معاشرتی سطح پر میکانکی انقلاب کے زیر اثر اس کے تشخص کی درہمی کا زائیدہ ہے:

من بہ تلاشِ تو روم یا بہ تلاشِ خود روم
عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگان کوی تو

خودی کے بعد اقبال کی توجہ کا مرکز "بے خودی" ہے جسے وہ عشق میں مزید استحکام و پختگی کے لیے ضروری گردانتے ہیں کیونکہ حقیقتاً بعد فنائے ہستی ہی مکمل مراتب دوام کا حصول ممکن ہے۔ علامہ موصوف کے نزدیک حالتِ بیخودی میں عاشق کا وجود بھی مشتبہ ہو جاتا ہے اس کی کوئی خبر دینے والا ہوتا ہے تو وہ بذاتِ خود اس کی "بے خودی" ہی ہوتی ہے۔

اقبال کی "زبور عجم" کا موضوع انسانیت قرآنیہ ہے جس کے لیے ان کے یہاں اس کے کئی نام ہیں اور انھوں نے کئی تعبیرات سے اس کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً مرد مومن، انسان کامل، بندۂ عشق، فقر، غیور، مسخر فطرت وغیرہ وغیرہ۔

اقبال کے مرد مومن کا ایمان وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد دائرہ عالم گھومتا ہے۔ اس کی ذات کائنات کی اصل و حقیقت اور اس کے سوا سب کچھ طلسم و مجاز و وہم و گمان ہے۔ اس کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ

ہے۔اس کی نگاہ و نظر سے تقدیریں بدل جاتی ہیں:

ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندار من است
ہمہ آفاق از گردش پرکار من است۔

اقبال کے "زبورِ عجم" جیسی فلسفیانہ کتاب میں بھی جابجا مغرب کے سیاسی اور فکری نظام پر نہایت سخت تنقید کی ہے اور اہل فرنگ سے سختی سے بیزاری اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ جس کا آغاز "پیام مشرق" میں ہوا تھا اور "زبور عجم" تک اس میں مزید شدت اور وسعت پیدا ہو گئی ہے لہٰذا ان کے اس مجموعۂ کلام کے دونوں حصوں میں ایسے اشعار جابجا ملتے ہیں جن میں زندگی کے خالص مادّی نقطۂ نگاہ کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل میں اس سے متعلق اشعار نقل ہیں:

زعلم و دانشِ مغرب ہمین قدر گویم
خوش است آہ و فغاں تانگاہ ناکام است
فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ

اقبال کا تعلق اپنے عہد کے ساتھ ایک باغی وقت کا تعلق تھا۔ ان کا عہد مغربی تہذیب کی عملداری کا عہد تھا اور اقبالؔ نے مغربی سامراج کے ہتھکنڈوں پر اپنی "زبور عجم" میں بھرپور وار کیا ہے۔ لیکن اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ انہیں یورپ سے نفرت ہے۔ یورپ کی تہذیب میں جہاں خرابیاں ہیں وہاں خوبیاں بھی ہیں۔اقبالؔ ان خوبیوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انکی زندگی کا بیشتر حصہ یورپی فلسفے کے مطالعے میں صرف ہوا اور یہ نقطۂ نگاہ ان کی فطرتِ ثانیہ بن گیا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر حقائقِ اسلام کا مطالعہ انھوں نے اسی نگاہ سے کیا۔

مارکس کی طرح علامہ اقبال بھی ایسے سماج کے حامی ہیں جس میں فرد کی آزادی کو تسلیم کیا جائے۔ ان کے نزدیک صرف مردانِ حر کی آنکھ بینا ہے۔ علامہ موصوف سرمایہ داری، سامراج اور جارحانہ پرستی کے شدید مخالف ہیں اور جمہوریت کی روح کو مانتے ہیں مگر مغربی جمہوری اداروں کی خامیوں پر انتہائی سخت

الفاظ میں مذمت کرتے ہیں کیونکہ سیاسی طور پر اقبالؔ کا اپنا دور ہندوستان کی غلامی کا دور تھا اس کے باوجود انہیں مشرق کے متعدد ممالک کی زنجیر غلامی پارہ پارہ ہوتی نظر آتی ہیں لہٰذا یوں گویا ہیں:

می رسد مردی کہ زنجیر غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما

اقبال نے کھلے دل اور چشم بصیرت سے زندگی کے حقائق کا مشاہدہ کیا۔ ان کے دل میں اسی بناء پر تجسس، تشکیک اور تحیر کی لہریں موجزن رہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کا رویہ اصلی اور ہے اور بلا شبہ عرفانِ ذات سے بر آمد ہوا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا حرکی تصور اور اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی دعوت دی گئی ہے نیز زندگی کو اس کے تمام خطرات اور امکانات کے ساتھ برتا جائے اس سلسلے میں ان کا رویہ مثبت ہے وہ زندگی کو مشکل امر گردانتے ہیں ان کے نزدیک موت بہت آسان ہے۔ وہ زندگی کو طوق گلو افشار ہونے کے باجود اپنے اندر امکانات رکھنے والی شے قرار دیتے ہیں۔ ان کی ''زبور عجم'' کے اشعار بھی اس بات کے غماز ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد کی زندگی کا صرف پامردی کے ساتھ سامنا ہی نہیں کیا بلکہ اس کو تمام خطرات و امکانات کے ساتھ برتا بھی ہے۔ ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کا جو عمل ہم کو اقبالؔ کی ''زبور عجم'' میں ملتا ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ مثلاً

زندگی در صدفِ خویش گہر ساختن است
ای کہ در قافلہ رو بی ہمہ رو باہمہ شو

بہ اعتبار جدیدیت:

اس میں ''زبور عجم'' کی ان غزلیات کو شامل کیا گیا ہے جن سے فکرِ اقبال میں تجدد و تغیر کے آثار نمایاں ہیں اور جن کا مطالعہ عرفانِ اقبال میں معاون ہے۔

اقبال کی ''زبور عجم'' میں تسلسل اور تغیر دونوں پر اصرار ملتا ہے صرف قدیم پر توجہ دینا اقبالؔ کے

ساتھ بڑی ناانصافی ہو گی۔ ان کے نزدیک زندگی میں ثبات اور تغیّر دونوں خصوصیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ نیز وہ کورانہ قسم کی تبدیلی کے سیلاب میں تنکے کی طرح بہنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ کچھ دوامی اصولوں کا احساس اور عرفان ضروری سمجھتے ہیں۔

''زبورِ عجم'' کی غزلیات میں بہت صاف زبان استعمال ہوئی ہے۔ اقبالؔ نے بالخصوص محاورات کی صحت کا بہت خیال رکھا ہے۔ اس ضمن میں وہ اپنے اشعار کی زبان و محاورات کی صحت کے متعلق گرامیؔ جالندھری کی رائے سے استفادہ کرتے تھے۔

لفظوں کے اصطلاحی اور لغوی معنوں کے تضاد سے لطف پیدا کرنا اقبالؔ کی ایک عمومی صفت ہے۔ محاورات کا استعمال کرتے ہوئے بھی اقبالؔ نے اس التزام کو برقرار رکھا ہے جس سے ''زبورِ عجم'' کے اشعار کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

اقبالؔ کو محاورات سے کس قدر شغف ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جن کے دونوں مصرعوں میں کوئی نہ کوئی محاورہ یا ضرب المثل موجود ہے۔ اس مرصع کاری کے لیے زبان کی وسیع معلومات الفاظ پر قدرت اور روایت سے کماحقہ واقفیت ضروری ہے جو بلا شبہ اقبالؔ کو حاصل تھی اور ان کے اسی کمال کا ایک زمانہ معترف ہے۔

اقبالؔ نے ''زبورِ عجم'' میں شعر کی زبان کو حسبِ تقاضا نئی شکل دی ہے اور اس کو نئے محاورے سے روشناس کیا ہے۔

اقبالؔ کے کلام کو تین ادوار میں منقسم کیا گیا ہے۔ ان کی فکر میں ایک مسلسل ارتقا ملتا ہے۔ اس فکری ارتقا نے ان کے یہاں لسانی ساخت اور شعری محاورے کو بھی تبدیل کیا ہے۔

ان کے لسانی تجربے دور رس امکانات رکھتے ہیں۔ فنی تکمیل کے نقطے تک پہنچنے کے لیے اقبالؔ نے لسانی اختراع، اجتہاد اور تخلیقی توانائی سے کام لیا ہے۔

اقبالؔ کے یہاں شعری محاورہ بدلا نہ ہوتا تو شاید انحراف و انقطاع کی نئی صورتیں سامنے نہ آتیں۔

اس کتاب میں اقبالؔ نے اسلوب بیان کی ایسی دلکش مثالیں پیش کی ہیں کہ اشعار 'از دل ریزد و بر دل خیزد' کے مصداق بن کر رہ گئے ہیں۔ چند اشعار بطور مثال درج کر رہی ہوں:

نماز بی حضور از من نمی آید
دلی آوردہ ام دیگر ازیں کافر چہ می خواہی
در سینۂ من دمی بیا سائی
از محنت و کلفت خدائی

"زبور عجم" میں ایسے متعدد اشعار ہیں جن میں اقبالؔ نے بلا مبالغہ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ چند اشعار بطور مثال درج ہیں:

چہ عجب اگر دو سلطاں بولایتی نہ گنجد
عجب ایں کہ می نگنجد بدو عالمی فقیری
از من بروں نیست منزلگۂ من
من بی نصیبم راہی نیا بم

اقبالؔ کی "زبور عجم" کی بیشتر غزلیات نہایت سادہ و سلیس ہیں۔ لیکن ساتھ ہی نہایت پُر مغز، با معنی ہیں۔ اقبالؔ کی یہ کوشش رہی ہے کہ ان کے اور قاری کے درمیان تفہیم کا فاصلہ کم سے کم باقی رہے اور ان کے اشعار از دل ریزد و بر دل خیزد کا مصداق معلوم ہوں۔ تاہم سلاست کے باوصف ان کی دلکشی اپنے طور پر برقرار ہے اور متانت و سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے تھامے رکھا ہے اور نہایت وسیع و عریض مضامین کو بہت کم لفظوں میں بیان کر دینا اقبالؔ کے عبورِ فن کا مظہر ہے۔ انھوں نے دقیق فلسفیانہ مضامین کو آسان الفاظ میں نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے نشتر اقبالؔ کی غزلیات کا عمومی جزو ہیں۔ سادگی کے ساتھ ان کی پرکاری قابل غور ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترنم، سوز، حسن آہنگ و موسیقیت کی جو فراوانی اور متنوع دلکشی ان کے اس مجموعے میں ہے وہ شاعر کی کسی دیگر کتاب میں نہیں۔ اس کے جذب و مستی اور وفور شوق کی متلاطم کیفیت وجد آفرین نغموں میں جھلک رہی ہے۔

واقعتاً شاعر کے جذبات و افکار نغمہ و آہنگ کے طوفان میں ڈھل کے نکلے ہیں۔ مثلاً چند اشعار نقل ہیں۔

بر دل من فطرت خاموش می آرد ہجوم
ساز از ذوق نوا خود را بہ مضرابی زند

"زبور عجم" کے دونوں حصوں کی غزلیات کا بغایتِ نظر مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں میں غزل کی روایتی کلاسیکی زبان اور لہجہ ہے۔ البتہ شاعر نے اپنے تخیل کے جمال و شکوہ، احساس، نغمہ و آہنگ اور جمالیاتی شعور سے اس میں حسن و تاثیر کی ایک منفرد دنیا آباد کی ہے اور اس کو نہایت پختہ، فنکارانہ مہارت سے افکار و معانی کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ مضامین کی متانت و سنگینی کے باوجود غزل کی لطافت بدستور برقرار رہی ہے اور اس سے حسن و رعنائی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

"زبور عجم" میں شاعر کے نالۂ نیم شب کا نیاز بھی ہے اور دل کی پوشیدہ بے تابیاں بھی۔ اس کی امنگیں اور آرزوئیں بھی ہیں اور اس کی جستجوئیں بھی۔ یہاں عشقِ گرہ کشا کے رقص کا ترانہ بھی ہے اور عقل فسوں پیشہ کا شکوہ بھی۔ وہاں ملّی اور اجتماعی مسائل کا ذکر و تجزیہ بھی۔ مگر تفکر و تامل کا اظہار جذبات کی زبان میں کیا ہے۔